تحریک پاکستان کے شاہد دو عظیم صحافی

وقار انبالوی اور شورش کاشمیری کے غیر مطبوعہ انٹرویو

عذرا وقار

یہ مقالہ پاکستان کے دو نامور صحافیوں وقار انبالوی اور شورش کاشمیری کے انٹرویو پر مشتمل ہے۔ جو گذشتہ چند سالوں کے دوران یکے بعد دیگرے ہم سے علیحدہ ہوگئے۔ طوالت کے خوف سے انٹرویو کی تلخیص کردی گئی ہے۔ ابتدا میں تحریک پاکستان کا مختصر سیاسی اور صحافتی پس منظر اور دونوں صحافیوں کے مختصر حالات زندگی دیے گئے ہیں اور حسب ضرورت وضاحت کے لیے حواشی کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ وقار انبالوی کا انٹرویو ۱۹۸۴ء میں خود لیا تھا جبکہ شورش کاشمیری کا انٹرویو راقمہ نے ریڈیو پاکستان اسلام آباد کی آڈیو لائبریری سے حاصل کیا ہے۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر میں برطانیہ کی استعماری طاقت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور محکوم اقوام میں جذبۂ قومیت سر اٹھا رہا تھا جو رفتہ رفتہ ایک تحریک بن کر ابھرنے لگا۔ اسی دباؤ کے تحت برطانوی حکومتِ ہند نے برصغیر میں آئینی اصلاحات کا آغاز کیا، جس کے نتیجے میں آئینی حقوق کے تحفظ کے لیے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس معرضِ وجود میں آئی۔ شروع میں اس جماعت کو متحرک کرنے میں ہندو اور مسلمان دونوں متحد تھے مگر بالآخر کانگریس کے ہندوؤں کے زیر اثر آ جانے کے باعث مسلم زعماء اس سے علیحدہ ہونے لگے۔ اسی اثنا میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے نہ صرف دو قومی نظریہ پیش کیا بلکہ انہیں عملی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے بھی تیار کیا اور اس غرض سے تحریک علی گڑھ کے تحت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد عمل میں لائے، جس نے مسلمانوں میں جذبۂ آزادی اور نئے علوم کو حاصل کرنے کی خواہش

پیدا کر دی۔ اسی تنظیم نے اپنے اجلاس منعقدہ ڈھاکہ میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ سیاسی تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا اور اس طرح ۱۹۰٦ء میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی۔

قائد اعظم محمد علی جناح (۱۸۷٦ء - ۱۹۴۸ء) کی مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد تحریک آزادی ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ انہوں نے میثاق لکھنؤ کے تحت ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کیں لیکن جلد ہی انہیں احساس ہونے لگا کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے۔ ہندوستان کی سیاسی فضا سے دل برداشتہ ہو کر وہ ۱۹۳۰ء میں انگلینڈ چلے گئے۔ پھر ۱۹۳۵ء میں دوبارہ واپس آکر انہوں نے مسلم لیگ کی باگ ڈور سنبھال لی اور انتھک محنت کر کے اسے کامیابی سے ہمکنار کیا۔

حصولِ آزادی کی جدوجہد میں سیاسی جماعتوں اور راہنماؤں کے ساتھ ساتھ مسلم اردو صحافت نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ انگریزوں کے ظلم و تشدد، جابرانہ پالیسیوں اور غیر منصفانہ قوانین کے اجراء کے خلاف مولانا ابو الکلام آزاد ــــــــ ، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان ڈٹ نہ جاتے تو برصغیر میں آزادی کا سورج اتنی جلدی طلوع نہ ہوتا۔ انہوں نے آزادی کی تحریک کو برصغیر کے کونے کونے تک پہنچایا۔ محمد علی جوہر کے "کامریڈ" اور "ہمدرد"، مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال"اور "البلاغ"، مولانا ظفر علی خان کے "زمیندار" نے سیاسی محاذ پر ایک انقلاب برپا کر دیا کیونکہ یہ تمام راہنما صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست دان بھی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد لاہور سے مسلمانوں کے متعدد روزنامے جاری ہو گئے تھے۔ جن میں "زمیندار" ، "سیاست"، "انقلاب"، "احسان" اور "شہباز" خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ہندو اردو اخباروں میں "پرتاپ"، "ملاپ" اور "بندے ماترم" بھی لاہور سے نکلتے تھے۔(۱) تحریکِ پاکستان کے دوران "زمیندار" نہ صرف مسلمانوں کی آواز تھا بلکہ وہ

ایک تربیتی ادارہ بھی تھا جس سے بہت سے صحافی تربیت پا کر نکلے جنھوں نے صحافت کی دنیا میں نام پیدا کیا۔ ان میں دو نامور صحافی وقار انبالوی اور شورش کاشمیری بھی تھے۔ جنھوں نے تحریکِ آزادی میں اہم کردار ادا کیا کیونکہ دونوں اپنے اپنے میدان کے شہسوار تھے۔ خود انہوں نے کئی نو آموز صحافیوں کی تربیت کی۔ دونوں کا تعلق مشرقی پنجاب سے تھا اور لاہور میں مستقلاً رہتے تھے۔ یہ دونوں کہنہ مشق صحافی، سیاسی میدان میں بھی سرگرم تھے۔ وقار انبالوی نے خاکسار تحریک(۲) اور شورش کاشمیری نے مجلس احرار اسلام(۳) میں شمولیت اختیار کی اور ان کی عدم تعاون کی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے۔ تاریخ پاکستان میں صحافت کے کردار کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ان دو نامور صحافیوں سے لیے گئے انٹرویوز قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

وقار انبالوی (۱۹۰۰ء۔۱۹۸۸ء)

وقار انبالوی ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ انبالہ کے موضع ملانا میں پیدا ہوئے۔ اصل نام ناظم علی تھا۔ ان کے والد صفدر علی اسکول ٹیچر تھے۔ وہ نوجوانی میں نوکری کی تلاش میں لاہور آ گئے اور مولانا ظفر علی خان کے اخبار "زمیندار " میں پروف ریڈر تعینات ہو گئے۔ وہیں پر ان کی ملاقات شورش کاشمیری سے ہوئی جو وہاں پہلے ہی سے کام کرتے تھے۔ ان دونوں صحافیوں کے درمیان ایسے مخلصانہ تعلقات قائم ہو گئے جو زندگی کے آخری ایام تک بدستور رہے۔ زمیندار کے بعد وقار انبالوی نے ہندو اخباروں ویر بھارت، پرتاپ اور ملاپ میں بھی کام کیا ۔ بعد ازاں وہ ادبی دنیا میں پروف ریڈر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جب یو۔ پی میں خاکساروں نے کانگریس حکومت کے خلاف محاذ قائم کیا تو یہ خاکسار تحریک میں شامل ہو گئے(۴) اور اپنے موٴقف کی حمایت میں بڑی زور دار نظمیں لکھیں۔ ۱۹۳۹ء میں روز نامہ احسان کے ایڈیٹر بنے اور مسلم لیگ کی حمایت میں زبردست نظمیں اور اداریے لکھے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں وقارانبالوی نے مسلم لیگ

کے لیے بہت کام کیا۔ پاکستان بننے کے بعد دوبارہ احسان کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پھر انہوں نے اپنا ذاتی اخبار سفینہ نکالا جسے سرفرانسس موڈی گورنر پنجاب نے بند کر دیا۔ بعد ازاں کچھ عرصہ تک وہ آفاق کے ایڈیٹر بھی رہے۔ جب ۱۹٦٦ء میں ندائے ملت کا اجراء ہوا تو وہ اس میں کالم نویس ہو گئے ۔ جب ندائے ملت اور نوائے وقت کا ادغام ہوا تو یہاں آ گئے اور باقی تمام عمر نوائے وقت ہی سے وابستہ رہے۔ خدا نے انہیں ذہانت کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ وہ اردو کے علاوہ کلاسیکی ہندی اور سنسکرت پر بھی عبور رکھتے تھے۔ انکی قومی و سیاسی شاعری کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ نوائے وقت میں‌ان کا کالم سرراہے اور قطعہ ہردلعزیز تھے ۔ کبھی کبھی اداریہ بھی لکھتے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندو اخباروں میں کام کرنےکے باعث وہ ہندوؤں کی ذہنیت کو بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے اور اپنے کالموں میں اس پر تبصرے بھی کرتے رہتے تھے۔ وقار انبالوی تقریباً نوے برس کی عمر میں ٢٦ جون ۱۹۸۸ء کو انتقال کر گئے اور شرقپور شریف کے قریب گاؤں سہجوال میں دفن ہوئے۔

وقار انبالوی سے انٹرویو

س: آپ صحافت میں‌کیسے آئے؟

ج: جنگ عظیم اول کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف مختلف قسم کی سازشیں شروع کر دی تھیں۔ ان دنوں لوگ بازاروں میں مجمع لگا کر "زمیندار" اخبار میں‌شائع شدہ نظمیں اونچی آواز سے پڑھ پڑھ کر رویا کرتے تھے۔ میں بھی شاعری کیا کرتا تھا اور نیا نیا فرسٹ پنجاب رجمنٹ سے فارغ ہوا تھا۔ مولانا ظفر علی خان نے مجھے زمیندار میں رکھ لیا۔ پروف ریڈنگ کے کام کے لیے بارہ روپے مہینہ اور مولانا ظفر علی خان کی میز وغیرہ صاف کرنے کے چھ روپے کل اٹھارہ روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ بعد میں مولانا نے میرے کام سے خوش ہو کر میری تنخواہ پچیس روپے ماہوار کر دی۔ ۱۹۱۹ء میں لاہور سے ایک

کانگرسی روزنامہ پرتاپ کے نام سے جاری ہوا۔ اس کے مالک مہاشہ کرشن ایک آریہ سماجی(۵) ہندو تھے جو ان دنوں ہندو مسلم اتحاد کے بڑے نقیب تھے۔ انہوں نے مجھے پچاس روپے مہینے پر ملازم رکھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ اپنی شاعری کی بنیاد انگریز دشمنی پر رکھنا۔ ان دنوں پنجاب میں ہندو مسلم اتحاد کابڑا چرچا تھا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ اس اتحاد کے پیچھے کیا تھا۔ جب پرتاپ شائع ہوا تو اس وقت جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آ چکا تھا۔ پرتاپ میں میری نظم بھی فرنگی کے خلاف تھی اور اداریہ بھی تلخ تھا، چنانچہ پہلا پرچہ ہی ضبط ہو گیا اور ایڈیٹر مہاشہ کرشن گرفتار ہو گئے اور ڈیڑھ برس کی قید کی سزا ملی۔ لیکن وہ ڈیڑھ ماہ بعد رہا ہو گئے اور اخبار پھر شروع ہو گیا۔ پھر ایک اور اخبار ملاپ جاری ہوا۔ یہ بھی آریہ سماجی تھا اور مہاشہ خرسند اس کے مالک تھے۔ میں ملاپ میں ملازم ہو گیا۔ مہاشہ کرشن اور مہاشہ خرسند کے بچوں کو صرف ہندی آتی تھی چنانچہ مجھے انہیں اردو پڑھانے کے لیے بھی مقرر کردیا گیا۔ پھر اردو کا ایک معیاری رسالہ ادبی دنیا مولانا تاجورنجیب آبادی نے نکالا۔ مجھے وہاں پروف ریڈر رکھا گیا۔ وہاں سید عابد علی عابد بھی کام کرتے تھے۔ اب حالات بدل چکے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں مجھے اخباراحسان کی ایڈیٹری تفویض ہوئی۔ اس سے پہلے مولانا مرتضیٰ احمد میکش ، چراغ حسن حسرت ، حاجی لق لق ، اور ایک آدھ اور صاحب بیک وقت احسان سے استعفیٰ دے کر نکل گئے تھے۔ میں یہ بات فخر کےساتھ کہہ سکتا ہوں کہ احسان پہلا اخبار تھا جس نےمسلم لیگ کی حمایت میں آواز بلند کی۔یہ پہلا روزنامہ تھا جس میں میں نے ٹیلی پرنٹر لگوایا اور حضرت قائداعظم سے اس کا افتتاح کروایا۔ ہندو اخباروں میں کام کر کے مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ لوگ ہندو اخبار اس لیے خریدتے تھے کہ وہاں خبریں تازہ ہوتی تھیں۔ پھر زمیندار اخبار کے بارے میں لوگوں کی یہ

رائے تھی کہ اس کی زبان اتنی عالمانہ تھی کہ عام لوگوں کے پلے نہیں پڑتی تھی۔ چنانچہ یہ باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ احسان بہت ہردلعزیز اخبار بن گیا۔ کئی برس تک میں اس اخبار سے وابستہ رہا۔ مجھے اور اخباروں کے ساتھ معاملات میں تلخ تجربہ بھی ہوا۔ جو اخبار نویس احسان کو چھوڑ گئے تھے انہیں یہ رنج تھا کہ یہ (وقارانبالوی) یہاں کیوں آگیا۔ اگر یہ نہ آتا تو احسان بند ہو جاتا۔ ان لوگوں نے اخبار شہباز نکال لیا تھا اور اس میں مختلف طریقوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کی طنز اور پھبتی بعض اوقات ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ انہوں نے ایک دفعہ لکھا کہ احسان کےمالک تو بہت خوش ہوں گے کہ ان کو ایسا ایڈیٹر ملا ہے جو اداریہ ، نظم ، فکاہیہ کالم اور تبصرے سب کچھ لکھ لیتا ہے۔ اور ان کا یہ حال ہو گا کہ ع

قدرت حق سے لگی ہے ہاتھ اندھے کے بٹیر

میں مولانا چراغ حسن حسرت کا بہت احترام کرتا تھا۔ لیکن میں نےاسی انداز میں جواب دیا کہ " اس چڑیا گھر میں تو بڑے بڑے جانور، گدھ ، کرگس رہ گئے ہیں۔ ان پر مالکوں نے فخر نہیں کیا تو مجھ ناچیز پر کیا فخر کریں گے" ۔ یہ چشمک چلتی رہی۔ کبھی کبھی مولانا عبدالمجید سالک بھی پھبتی کس دیتے۔ ان کا انداز یہ تھا کہ مسلمان لیڈروں کے نام بگاڑ دیتے تھے۔ مثلاً ابوالکلام آزاد کو ،ابوالسکوت پامال، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو ،بُخار اللہ شاہ عطائی، لکھ دیتے۔ ایک دن انہوں نے میرا نام ،انبال وقاروی، لکھ دیا۔ میں نے لکھاکہ نام بگاڑنا مسلمانوں کی شان کےخلاف ہے۔ ورنہ ہم بھی انہیں سالک بٹالوی کی جگہ ،بالک سٹالوی، لکھ دیتے۔ وہ بہت محظوظ ہوئے اور مجھے بلا کر چائے کی دعوت دی۔ خلافتی مسلمانوں نے خلافت تحریک کے خاتمے کےبعد مجلس احرار بنا لی تھی۔ یہ کانگرس کے ہوا خواہ تھے چنانچہ میں‌خاکسار تحریک کی حمایت کرتا تھا۔

احسان کی ایڈیٹری کے بعد میرا واسطہ جن لوگوں سے پڑا ان میں ایک تو مجید لاہوری تھے، دوسرے شورش کاشمیری۔ شورش سے میری پہلی ملاقات مولانا ظفر علی خان کے ہاں ہوئی۔ یہ ١٩٣٤ء کا ذکر ہے۔ مولانا ان دنوں برما کے دورے سے واپس آئے تھے۔ میں ان کے دفتر گیا تو شورش، مولانا کی چلم بھر کر لائے۔ ان کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ میں حمید نظامی کے ساتھ بھی اٹھتا بیٹھتا تھا۔ ان دنوں اخبار ہمدرد لکھنؤ کے مالک عبدالحفیظ ایک مسلم نیوز ایجنسی قائم کرنا چاہتے تھے۔ میرے مشورے سےانہوں نے حمید نظامی صاحب کو اس کام کے لئے چنا۔ لاہور سے ایک ہفت روزہ "نوائے وقت" کے نام سے نکالا گیا اور اس کا تمام کام حمید نظامی کےسپرد ہوا۔ جس دن قرار داد پاکستان پاس ہوئی، اس دن نوائے وقت روزانہ ہو گیا۔ کیونکہ فوج میں پنجابیوں کا حصہ بہت زیادہ تھا اور یہاں ان کے رشتہ دار بہت پریشان تھے اس لیے جنگ عظیم دوم کے شروع میں کچھ صحافیوں کو مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے محاذ جنگ پر بھیجنے کے لیے کہا گیا۔ چنانچہ بمبئی سے بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبداللہ دھلوی ، بنگال سے امرت بازار پتریکا کے ایک صحافی، پٹنہ و مدراس اور الہ آباد سے ایک ایک ایڈیٹر اور پنجاب سےمیں گیا۔ مشرق وسطیٰ پہنچے تو ہمارا ہوائی جہاز دریائے نیل پر اترا۔ وہاں جا کر ہمیں فوجیوں کی خیر و عافیت کے بارے میں ریڈیو سےتقریریں کرنا اور ان کے پیغامات نشر کرنا تھے۔

س: تحریک پاکستان کے سلسلے میں آپ نے کیا کام کیا؟

ج: ١٩٤٦ء میں پاکستان کےسلسلے میں انتخابات ہوئے تو میں پنجاب مسلم لیگ کی پبلسٹی شاخ میں تھا۔ میں نے دن رات سفر کیا اور مسلم لیگ کے حق میںجگہ جگہ تقریریں کیں۔ میں ان دنوں پنجاب مسلم لیگ کونسل کی طرف سے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ممبر بھی رہا۔ احسان اخبار مسلم لیگ کے لیے وقف تھا، اس لیے میں مسلم

لیگ کی حمایت میں لکھتا رہا۔

س: آپ علامہ اقبال سے ملے؟

ج: عبدالمجید سالک کے ساتھ کبھی کبھار علامہ اقبال سے ملنے جاتا تھا اور بیٹھ کر باتیں سنتا رہتا تھا۔

س: قیام پاکستان کےبعد آپ کیا کرتے رہے ؟

ج: پاکستان بننے کےبعد میں دوبارہ احسان کا ایڈیٹر بنا۔ پھر میں نے اپنا ذاتی اخبار سفینہ نکالا۔ سفینہ میں میری گورنر فرانسس موڈی کے ساتھ زبردست قلمی جنگ ہوئی۔ کیونکہ میں نےاپنے اخبار میں یہ رپورٹ چھاپی تھی کہ سرفرانسس موڈی اہم دستاویزات غائب کروا رہا ہے۔ چنانچہ گورنر نےجاتے جاتے میرا اخبار بند کروا دیا۔ تب میں نے نوائے وقت میں نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ تھوڑے دن روزنامہ آفاق میں بھی کام کیا۔ پھر نوائے وقت سے تعلق شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔

شورش کاشمیری (۱۹۱۷ء-۱۹۷۴ء)

شورش کاشمیری ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام عبدالکریم تھا۔ بچپن سے اپنے دادا کے پاس لاہور میں رہے اور تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی کلاسوں میں وہ گھر پر احسان دانش سے پڑھا کرتے تھے۔ میٹرک ہی میں انہوں نے نظمیں لکھنا شروع کر دیں جو سیاست اور زمیندار میں چھپتی تھیں۔ جلد ہی انہوں نے نثر لکھنی شروع کر دی۔

حصول تعلیم کے بعد شورش نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی۔ وہ ۱۹۳۵ء میں تحریک مسجد شہید گنج کے سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ اس وقت مسجد شہید گنج مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان نزاع کا باعث بنی ہوئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم

کے آغاز (۱۹۳۹ء) میں شورش مجلس احرار کے سیکرٹری کی حیثیت سے فوجی بھرتی بائیکاٹ کے سلسلے میں نظمیں لکھنے اور تقریر کرنے کے جرم میں پھر گرفتار ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک قید میں رہے۔ وہ مجلس احرار اسلام کے سہ روزہ اخبار آزاد کے ایڈیٹر بھی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد دوبارہ ۱۹۴۹ء یہ فرائض انجام دینے کے بعد انہوں نے ہفت روزہ چٹان نکالا اور اپنی تحریروں سے ثابت کر دیا کہ وہ دل و جان سے پاکستان کے تحفظ اور بقا کے حامی تھے۔ تاہم اس سے ان کے اس مؤقف میں بھی کوئی فرق نہ آیا کہ متحدہ قومیت کے طرفدار مسلمان غدار نہ تھے بلکہ وہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لیے مسلم لیگ سے علیحدہ نقطۂ نظر رکھتے تھے۔

دو درجن کے قریب مستقل کتابوں کے علاوہ، شورش نے سیاسی اور طنزیہ و مزاحیہ شاعری اور چٹان کے اداریے، کالم اور مضامین اپنے ورثے کے طور پر چھوڑے ہیں۔ ان کی نثر خوبصورت ہے اور انداز تحریر میں ایک ترشی اور شوخی موجود ہے(۷)۔ ان کا بات کرنے کا انداز بے باکانہ ہوتا ہے اور اپنے مؤقف پر ڈٹے رہتے ہیں۔ صحافت کے ذریعے انہوں نے کئی سیاسی لڑائیاں لڑیں اور حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہتے رہے، اس لیے قیام پاکستان کے بعد بھی وہ مختلف اوقات میں قید ہوتے رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے تقریباً تیرہ برس جیل میں گزارے اور اس دوران انہیں وسیع مطالعے کا موقع ملا۔ تاریخ و ادب کی شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو گی جو ان کی نظر سے نہ گزری ہو۔ وہ ایک اچھے ادیب، صحافی اور سیاست دان ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے پاکستان میں اسلام کی بالا دستی کے لیے جنگ لڑی۔ شورش کا ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا اور وہ میانی صاحب میں دفن ہوئے۔

شورش کاشمیری سے انٹرویو

س: تاریخ کو محفوظ کرنے کا ایک ذریعہ روایت بھی ہے۔ تحریکِ پاکستان ، اس دور کے قید و بند کے تجربات، اور تحریک احرار سےاپنی وابستگی کے حوالے سے کچھ فرمائیں ؟

ج: تاریخ ایک سچائی ہے۔ یہ قوموں کے حافظے کا نام ہے۔ جو کچھ افراد اور معاشرے پر گزرتا ہے،وہ اسے من وعن بیان کر دیتی ہے۔ جو قومیں تاریخ کا ساتھ دیتی ہیں، تاریخ ان کا ساتھ دیتی ہے۔ جو قومیں تاریخ کو یاد رکھتی ہیں۔ تاریخ انہیں یاد رکھتی ہے۔ میں تحریکِ پاکستان میں اور مسلم لیگ کی تحریک میں شامل نہ تھا۔ جب قائداعظم کے واپس ہندوستان آنے پر مسلم لیگ کی نشاۃ الثانیہ ہوئی، اس وقت میں جیل میں تھا۔ کیونکہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۶ء تک کے عرصے میں زیادہ تر جیل ہی میں رہا۔ یہ زمانہ میری جوانی کا تھا۔ میں بالعموم ایسی سیاسی تقریریں کرتا تھا جن میں تدبر کم اور جوش زیادہ ہوتا تھا اور اسی جرم میں پکڑا جاتا۔ اسی دوران مسلم لیگ کافی فعال ہو گئی۔ اس نے یہ نعرہ لگایا کہ ہم ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ہماری ایک انفرادیت ہے اور ہمارا پیدا ہونے سے مرنے تک کا دستورالعمل اپنی ہمسایہ قوم سے مختلف ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں تھا کہ ہندو قوم کا معاشرتی و سیاسی اعتبار سے رویہ ایسا تھا کہ جیسے مسلم قوم کا وجود ہی نہیں۔ یا جیسے ہم اجنبی ہیں یا اچھوت ہیں لیکن ہم مسلم لیگ میں اس لئے شامل نہ ہوئے تھے کہ یہ جماعت ہماری توقعات کے مطابق نہ تھی۔ خود میں برطانوی استعمار کے خلاف تھا اور غلامی کی زنجیر کو توڑنا چاہتا تھا۔ گو میں قائد !عظم کی ذات کے حوالے سے تو مطمئن تھا لیکن ان کے ساتھ جو خطاب یافتہ لوگ تھے، ہم ان سے بدکتے تھےاور سمجھتے تھے کہ ان کی سیاست انگریز کے مفاد کے تابع تھی۔ اس کے برعکس متحدہ قومیت کے حامی مسلمان اس

انتظار میں تھے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانوی استعماری طاقت کمزور ہو اور اس کی یہ کمزوری ہندوستان کی آزادی کا ذریعہ بن جائے۔ پھر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک میں سات برس جیل میں رہا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ نہ ہمیں اخبارات ملتے تھے اور نہ کسی اور ذریعے سے پتہ چلتا تھا کہ سیاست میں کیا پیش رفت ہو رہی ہے۔ بہر حال یہ بات ہم تک ضرور پہنچی کہ پاکستان کا ریزولیوشن (۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء) پاس ہو گیا ہے۔

س: پاکستان ریزولیوشن کے پاس ہونے کی خبر سن کر آپ کے تاثرات کیا تھے؟

ج:جب ہم تک یہ خبر پہنچی تو ہم نے سمجھا کہ قائد اعظم نے مسلمانوں کے لیے ایک نصب العین اختیار کیا ہے اس میں مسلمانوں کی بقا کا سامان ہے کیونکہ وہ ایک مخلص انسان ہیں۔ لیکن ہم خود ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو برطانوی استعمار سے برسرپیکار تھا۔ ہم خود تکلیفیں برداشت کررہے تھے۔ اس گروہ میں ہندو، مسلمان اور سکھ سب شامل تھے۔ چنانچہ ہم اس انداز سے نہیں سوچتے تھے جو مسلم لیگ کا نقطۂ نظر تھا۔ ہمارے خیال میں قائداعظم ہندوؤں سے زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل کرنا چاہتے تھے اور تقسیم ملک ناممکن تھی۔ جب میں رہا ہوا تو مسلمانوں کو تحریک پاکستان کی کامیابی کی امید پیدا ہو چکی تھی۔ خود میں ذہنی طور پر مجلس احرار کےاس گروہ سے تھا جو اب پاکستان کا حامی تھا اور اس کا خیال تھا کہ جب ہندوستان کے مسلمان اس بات میں اپنی بہتری سمجھتے تھے اور ان کا اجتماعی مطالبہ یہ تھا کہ انہیں ایک الگ خطۂ زمین دیا جائے تو اس مطالبے اور انکی ملّی انا سے لڑنا غلط تھا۔ اسی کشمکش میں دن گزرتے گئے اور بالآخر پاکستان بن گیا ۔ میں مسلم لیگ کی سیاست کے قریب نہ ہو سکا لیکن میں اس سے بالکل کنارہ کش بھی نہ رہا۔ سردار عبدالرب نشتر میرے ذاتی دوست تھے اور میں نے ان دنوں مسلم لیگ

کی اندر خانہ بہت خدمت کی۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ مجھے پسند کرتے تھے۔ پھر جب تقسیم کے وقت لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو نواب ممدوٹ نے مجلس احرار کے نوجوان کارکنوں کو بہت سی ذمہ داریاں سونپیں اور ہم نے بے شمار مسلمان خاندانوں کو ہندوؤں کے محلوں سے نکالا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان بن جانے کے بعد مجلس احرار کےزعماء کی زیادہ مخالفت نہیں ہوئی۔ بہر حال سیاسی فیصلوں میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ کوئی الہامی چیز نہیں، نہ دین کادرجہ رکھتی ہے۔ مجلس احرار کی پاکستان مخالفت ایک عظیم غلطی تھی اور غلطی کا اعتراف کرنے میں ہی بہادری ہے۔

س: اے-او ہیوم نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد ڈالی جو خود انگریز تھا۔ پھر ایم این رائے نے بھی اپنی کتاب HISTORICAL ROLE OF ISLAM IN INDIA میں تسلیم کیا ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس دراصل انگریز کی تخلیق تھی۔ اس وقت لارڈ رپن اور لارڈ لٹن کادور تھا۔ یہ دونوں بڑے زیرک تھے۔ انہوں نے کچھ ایسے لوگوں کو جمع کیا جن کا عوامی تخیل مختلف ہو اور انگریز کا ساتھ دے سکیں۔ چنانچہ اے-او- ہیوم نے یہ معرکہ سر انجام دیا کیونکہ وہ ہندوستان کے بارےمیں ہمہ جہتی معلومات رکھتا تھا۔ چنانچہ ابتدائی نو دس اجلاسوں میں کانگریس نے صرف انگریز سے اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ مہاتما گاندھی نے تحریک خلافت میں دلچسپی لے کر مسلمانوں کے جذبات سے فائدہ اٹھایا اور سوائے قائداعظم کے، جو یہاں سے لندن چلے گئے تھے، سب مسلمان لیڈر مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، دیوبند کے علماء، احرار کے زعماء، اور جمعیت العلمائے ہند کے محترم اراکین مہاتما گاندھی سے دھوکہ کھا گئے۔ بعد ازاں علامہ اقبال کےاصرار پر قائد اعظم وطن واپس آئے اور تمام برصغیر کے مسلمانوں کی آواز بن گئے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ سرسکندر کی وزارت کے دوران لاہور ریزولیوشن پاس ہو جاتا۔

س: آپ جیل میں ہونے کے باعث مسلم لیگ کی تحریک میں حصہ نہ لے سکے تھے۔ لیکن آپ کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ کانگرس کے اس پروپیگنڈے کا مجلس احرار پر کافی اثر تھا کہ مسلم لیگ انگریزوں کی حاشیہ نشین ہے۔ حالانکہ بعد کے حالات نے ثابت کر دیاکہ انگریز کبھی بھی ملک کو تقسیم نہ کرنا چاہتا تھا۔ جہاں تک آپ کے جیل جانے کا تعلق تھا تو صوبہ سرحد میں دس ہزار مسلم لیگی ڈاکٹر خان صاحب کے دور وزارت میں جیل گئے تھے۔ ان تمام سوالات کا مقصد یہ ہے کہ آپ ہمیں تفصیل سے بتائیں کہ مسلم لیگ میں شامل نہ ہونے کے ساتھ ساتھ کانگرس سے آپ کا کیا تعلق تھا۔

ج: اگر یہ رائے تسلیم کر لی جائے کہ کانگرس کی ابتداء چونکہ انگریزوں نے ڈالی تھی، اس لئے اس کا کردار مشکوک تھا تو انگریزوں نے تو برصغیر میں بے شمار چیزوں کی بنیاد ڈالی تھی اور ہم ان سے اپنی قومی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور ہم نے اپنی جدوجہد کی بنیاد انہیں پر ڈالی - مثلاً پریس انگریز لایا تھا، اخبار نویسی میں سب سے پہلا جو ایڈیٹر یہاں سے پکڑا گیا، وہ بھی انگریز تھا۔ یہ ریل گاڑی، یہ ہوائی جہاز، یہ ٹیلی فون، سب انگریز لائے تھے۔ تحریک خلافت کےسلسلےمیں گاندھی کے ساتھ ساتھ انگریزوں اور مسلمانوں کا رویہ بھی قابل غور ہے۔ تحریک خلافت کے وقت جو جہاد کا سلسلہ شروع ہوا اور کئی لوگ تختۂ دار پر کھینچے گئے، بنگال، پٹنہ اور بہار میں تو یہ تحریک دب گئی لیکن جب یہ پنجاب، آزاد قبائل اور افغانستان میں پہنچی، اور بالاکوٹ میں جب مجاہدین نے جہاد شروع کیا تو انگریزوں نے بڑی کوشش کی کہ مسلمان کے ذہن سے جہاد کا جذبہ ختم ہو جائے۔ اس زمانےمیں انگلستان کے وزیر نے کہا کہ ہمارے راستے میں دو چیزیں حائل ہیں۔ ایک محمدؐ کی تلوار اور دوسرا محمدؐ کا قرآن۔ سرولیم مور، جو انگلستان کی کسی یونیورسٹی(۸) کا وائس چانسلر تھا، نے ڈپٹی نذیر احمد کو ایل ایل ڈی کا خطاب دلوایا کیونکہ ڈپٹی

نذیر احمد پہلے مسلمان تھے جنہوں نے "اولی الامر" کا ترجمہ کرتے وقت انگریز مراد لیا تھا۔ وہ تفسیر قرآن میں سب سے پہلے تحریف کرنے والے تھے۔ ولیم مور نےمسلمان کےجذبۂ جہاد پر ایک کتاب لکھی جس کا جواب سرسید احمد خاں نےدیا تھا اور اس سے نبٹنےکے لیے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب کی وجہ سے سر سید پر مقدمہ چلانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ ہندوستان میں مختلف الخیال قومیں بستی ہیں اور ان پر حکومت کرنا انگریز کے لیے آسان نہ تھا چنانچہ ہیوم نے سوچا کہ یہاں کے حالات کے مطالعہ کے لیے ہمیں ایک سٹیج کی ضرورت ہے جہاں ہندوستان کے نامور سیاست دان جمع ہوں اور اپنے خیالات کا اظہار کریں اور ہم ان کے خیالات کے بین السطور میں سے ہندوستان کے مافی الضمیر کا مطالعہ کریں۔ لیکن تحریکیں، سیاست اور تنظیمیں کسی ایک نام سے وابستہ نہیں ہوتیں۔ پھر مسلم لیگ بھی قائداعظم سے پہلے مختلف ہاتھوں میں رہی، مثلاً سر شفیع، سرظفراللہ، ایسے لوگ تھے جن سے قائد اعظم کو اتفاق نہ تھا۔ جب مسلم لیگ بنی تھی تب اس کا مزاج اور تھا اور بعد میں اور ہو گیا۔ تو کسی جماعت کو ہم اس لیے قابل گردن زدنی قرار نہیں دے سکتے کہ اس کی بنیاد مختلف حالات میں پڑی تھی۔ جب مہاتما گاندھی نے کانگرس کا اقتدار سنبھالا تو اس وقت مسائل اور تھے۔ جب خلافت کی تحریک چلی اور کلکتہ کانگرس کے اجلاس سے گاندھی واپس آئے تو ملک کا سیاسی مزاج بالکل بدل گیا۔ لیڈرشپ بدل گئی، مسلمانوں کی بھی اور ہندوؤں کی بھی۔ گوکھلے بھی گئے، اور دادا بھائی ناروجی بھی گئے۔ ظاہر ہے ملک کی لیڈر شپ بدلنے کے لیے پروگریسوازم کی ضرورت تھی یعنی کہ کھل کراحتجاج کیا جاتا۔ خواص سے بات کرنے کا طریقہ اور ہوتا ہے۔ عوام کو استعمال کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم انکو ان خطرات سے آگاہ کرتے جو انکی قومی بنیاد کے خلاف تھے۔ گاندھی نے جب دیکھا کہ مسلمان خلافت کے مسئلے پر دکھی ہے۔

وہ محض ہندوستانی نہیں بلکہ اسلامی ذہن رکھتا ہے اور مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ انکے عالمی مسئلے میں انکا ساتھ دیا جائے۔

س: گاندھی نے یہ نعرہ لگایا کہ وہ مسلمانوں کے لیے کچھ کریں گے، لیکن یہ نعرہ کچھ عرصہ بعد خاموش ہو گیا؟

ج: تحریکِ خلافت کو ختم کرنےمیں گاندھی جی کا ہاتھ نہ تھا۔ خلافت کو عربوں اور خود مصطفیٰ کمال نے ختم کیا۔ مسلمان خود تحریکِ خلافت سے انکاری ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ہم اپنی حکومتیں وطنیت کی بنا پر قائم کریں گے تو گاندھی سے کیا توقع کی جاسکتی تھی؟ گاندھی کا تحریک پاکستان کے بارے میں جو نظریہ تھا، وہ ایک ہندوستانی کانظریہ تھا۔ وہ انسان کی حیثیت سے سوچتا تھا اور ایک مکمل ہندو تھا۔ جس طرح مجھے اور قائداعظم کو بطور مسلمان سوچنے کا حق حاصل تھا، اسی طرح گاندھی کو بھی بطور ہندو سوچنے کا حق حاصل تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ حق و انصاف سے سوچتا تھا یا نہیں۔ قائد اعظم سمجھتے تھے کہ مسلمان کی حیثیت ہندوستان میں کمزور ہے اس لیے انہوں نے علیحدہ ملک کا نعرہ لگایا اور ان کی انفرادیت اور قومیت کو مضبوط کیا۔ گاندھی یہ سمجھتے تھے کہ اکثریت ان کی قوم کی تھی - جمہوریت میں جس قوم کی اکثریت ہو اس کا بول بالا ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں مسلم لیگ کے نعرہ سے فرقہ واریت کی بو آتی تھی۔

س: علامہ اقبال کے بارے میں کچھ فرمائیں ؟

ج: ان سے تین ملاقاتیں ہوئیں۔ سب سےپہلے میں مولانا ظفر علی خان کے ساتھ گیا۔ وہ دونوں علمی، ادبی اور سیاسی موضوع پر باتیں کرتے رہے، جن میں ایک بات مشترک تھی کہ علامہ اقبال مسلمانوں کے لئے بہت مضطرب تھے۔ دوسری ملاقات سید عطا اللہ شاہ بخاری کے ساتھ ہوئی تھی۔ شاہ صاحب نے علامہ اقبال کی نعت الحان کے ساتھ

انہیں سنائی، پھر قرآن شریف کی آیات اور احادیث سنائیں، تو علامہ اقبال آبدیدہ ہو گئے۔ تیسری بار چوہدری افضل حق کے ساتھ ملا تھا۔ یونینسٹ حکومت کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ ان لوگوں سے کسی خیر کی توقع نہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کرنا مسلمانوں پر فرض تھا لیکن ہندو کی سیاست پر زیادہ اعتماد کرنا بھی مناسب نہیں۔ میں زندگی میں علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد ، مولانا محمد علی جوہر ، مولانا ظفر علی خان اور حسرت موہانی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔

س: کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نےتحریک آزادی میں حصہ نہ لیا تھا؟

ج: مسلمانوں کا تحریک آزادی میں بہت ہاتھ تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پیش کیا تھا۔ اگر تحریک خلافت پیدا نہ ہوتی تو کانگرس کی تحریک بھی اتنا زور نہ پکڑتی۔ مسلمانوں نے اسے زبان دی، اسے نظریہ دیا، اسے عمل دیا ، اسے کارکن دیئے، انسے خطیب دئیے(۹)۔

اختتامیہ :

گذشتہ اوراق کے تجزیے کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ تاریخ کسی گزرے ہوئےعہد کی سرگذشت ہوتی ہے اور اس میں سرگرم شخصیات خود اپنی آنکھوں سے مختلف واقعات نہ صرف مشاہدہ کرتی ہیں بلکہ اس دور کی دیگر شخصیات سے بالمشافہ ملتی ہیں۔ چنانچہ ایسی شخصیات کی شہادت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ تحریک پاکستان کی روئیداد بھی اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ شومئ قسمت سے اس میں حصہ لینے والی شخصیات بھی معدوم ہوتی جا رہی ہیں، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ جو شخصیات اس میں بہ نفس نفیس شریک تھیں، ان سے ملکر اس دور کا آنکھوں دیکھا حال آنے

والی نسلوں تک پہنچایا جائے تاکہ جس نسل نے پاکستان کو خود بنتے نہیں دیکھا، وہ اپنے بزرگوں کی آنکھ سے اس کا تصوّر کر سکے۔ مذکورہ بالا انٹرویوز اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ انہیں پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ جب کوئی تحریک زوروں پر ہوتی ہے تو اس میں مختلف خیالات رکھنے والے انسان شامل ہوتے ہیں۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا ہے، زیادہ مقبول رجحانات ہی باقی رہ جاتے ہیں اور یوں کوئی تحریک اپنے مقصد کو پالیتی ہے۔

وقار انبالوی اور شورش کاشمیری دونوں میں یہ قدر مشترک تھی کہ وہ عوام میں سے تھے۔ انہوں نے جو منزل پائی، اپنی ہمت سےحاصل کی۔ وقارانبالوی نے مولانا ظفر علی خان کی میز صاف کرنے کو اپنے لیے باعث افتخار جانا۔ انہوں نے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں مسلم لیگ کی حمایت میں لکھا اور پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے لیےکوشاں رہے۔ شورش کاشمیری نے قیام پاکستان سے پہلے جدوجہد آزادی میں قید بھی کاٹی اور معاشی تنگدستی سے بھی دو چار رہے لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے رسالے چٹان میں انہوں نے نہایت درد مندی سے پاکستان کی بہتری اور اسلام کی سربلندی کے لیے لکھا۔ دونوں حضرات کی زندگی کی جدوجہد سے ہم اندازہ لگاسکتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے دوران عام لوگوں نے کس طرح اس میں حصہ لیا اور برصغیر کی آزادی کے لیے کام کیے۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۳۳۸

۲۔ نوائے وقت (راولپنڈی)، ۲۷ جون ۱۹۸۸ء

۳۔ شورش کاشمیری۔ پسِ دیوارِ زنداں، مطبوعات چٹان، لاہور، ۱۹۷۱ء،

ص ٣٦

۴۔ خاکسار تحریک، ۱۹۳۱ء میں نہرو رپورٹ کے رد عمل کے طور پر عنایت اللہ مشرقی نے شروع کی۔ یہ ایک نیم عسکری تنظیم تھی اور اس کا مقصد ہندی مسلمانوں کی زندگیوں کو اسلام کے مطابق ڈھالنا تھا۔

۵۔ آریہ سماج ، شمالی ہند میں ہندو مذہب کے احیاء کی تحریک تھی جس میں مذہبی جنون زیادہ تھا۔ سوامی شردھا نند اور لالہ لاجپت رائے اس کے دو بڑے لیڈر تھے۔ ملاحظہ ہو سید حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، اشاعت سوم، کراچی ۱۹۸۲ء، ص ۴۹۔۵۰

٦۔ شورش کاشمیری، بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل۔ ص ۲۲۸۔ ۲٦۱

٧۔ عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان، ص ۵۲۴.

۸۔ ایڈن برا یونیورسٹی مراد ہے، سرولیم مور (۱۸۸۵ء ۔ ۱۹۰۲ء تک پہلے اس کے پرنسپل اور پھر وائس چانسلر رہے۔ ملاحظہ ہو

C.E. Buckland, *Dictionary of Indian Biography*, New York, 1969, p. 304.

۹۔ مندرجہ بالا انٹرویو دیتے وقت شورش کافی بیمار تھے۔